بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

دیباچہ

تاریخ کے مطالعہ سے یہ حقیقت الم نشرح ہوتی ہے کہ انبیاء علیہم السلام نے انسانی معاشرہ کی ہمیشہ نئی شیرازہ بندی کی ہے۔ انھوں نے ایک بنیادی دعوت کی طرف انسانوں کو پکارا اور اس دعوت پر لبیک کہنے والوں کو ایک نئے اتحاد میں جوڑ دیا۔ وہ انسان جو مختلف گروہوں، قبیلوں اور عصبیتوں میں بٹے ہوئے تھے، جو ایک دوسرے کے خون کے پیاسے اور عزت کے دشمن تھے اس دعوت کی وجہ سے ایک دوسرے کی عزت کے محافظ بن گئے۔ اس اتحاد سے ایک نئی قوت رُونما ہوئی اور ''رُحَمَاءُ بَیْنَھُمْ'' کے یہ پیکر سب سے اہم تاریخ ساز اور تہذیب گر بنے۔ یہی وہ حقیقت ہے جس کی طرف قرآن اپنے بلیغ انداز میں اشارہ کرتا ہے کہ:

وَاذْكُرُوا نِعْمَتَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ اِذْ كُنْتُمْ اَعْدَآءً فَاَلَّفَ بَيْنَ قُلُوْبِكُمْ فَاَصْبَحْتُمْ بِنِعْمَتِهٖٓ اِخْوَانًا ۚ وَكُنْتُمْ عَلٰى شَفَا حُفْرَةٍ مِّنَ النَّارِ فَاَنْقَذَكُمْ مِّنْهَا ۭ (ال عمران: ۱۰۳)

''اور اللہ کی اس نعمت کو یاد کرو جب تم آپس میں شدید دشمن تھے، تو اس نے تمہارے دلوں کو جوڑ دیا اور تم اس کی عنایت و مہربانی سے بھائی بھائی ہو گئے۔ (بیشک) تم آگ کے گڑھے کے کنارے کھڑے تھے۔ پس اس نے تم کو اس سے نجات دی (اور تباہی سے بچالیا۔)''

انبیاء علیہم السلام نے انسانوں کو اسی بات کی دعوت دی ہے کہ:

وَاعْتَصِمُوْا بِحَبْلِ اللّٰهِ جَمِيْعًا وَّلَا تَفَرَّقُوْا ۠ (ال عمران: ۱۰۳)

''اللہ کی رسی کو مضبوط تھام لو۔ (مجتمع ہو جاؤ، اور پھوٹ نہ ڈالو)

اسلام کی یہ اجتماعیت محض خارج کی اجتماعیت نہیں، بلکہ دلوں کی اجتماعیت ہے اسلام محض قانونی اتحاد کو اتحاد نہیں سمجھتا۔ وہ اس بیرونی اتحاد کی بنیاد انسانی قلوب میں رکھتا ہے۔ اس کی اصل، عقیدہ اور نظریہ کا اتحاد، امنگوں اور تمناؤں کا اتحاد، عزائم اور جذبات کا اتحاد ہے۔ وہ خارج میں بھی سب کو ایک شیرازہ میں منسلک کرتا ہے اور داخلی طور پر بھی ان کو ایک اخوت اور برادری میں جوڑ دیتا ہے، اور حق یہ ہے کہ سچا اتحاد اسی وقت رونما ہوتا ہے جب یہ دونوں کیفیتیں پوری ہو رہی ہوں۔ مصنوعی اتحاد کبھی دیرپا نہیں ہوتا۔ نفرت اور بغض سے بھرے ہوئے دل کبھی جڑ نہیں سکتے۔ جھوٹا رکھ رکھاؤ کوئی اتحاد پیدا نہیں کر سکتا۔ خود غرضانہ اتحاد انتشار اور افتراق کا پیش خیمہ ہوتا ہے اور محض قانونی بندھن کسی حقیقی ملاپ اور رفاقت کی بنیاد نہیں بن سکتے۔ یہی وجہ ہے کہ اسلام نے اجتماعیت کی بنیاد ایمان، محبت اور ایثار پر رکھی ہے۔ اس بنیاد پر تعمیر ہونے والے تعلقات وہ آہنی چٹان ہوتے ہیں جس سے ٹکرا کر بڑے بڑے طوفان بھی اپنا سر ہی پھوڑ سکتے ہیں۔ اسے کوئی نقصان نہیں پہنچا سکتے۔

پھر ان بنیادوں پر وہ معاشرہ استوار ہوتا ہے جس میں تنازع للبقا کی جگہ تعاون و اشتراکِ عمل رونما ہوتا ہے۔ جہاں ہر شخص دوسرے کا سہارا ہوتا ہے اور ہر فرد دوسرے کا معاون اور مددگار۔ جہاں گرتے ہوئے کو گرنے نہیں دیا جاتا، بلکہ بیسیوں ہاتھ اس کی مدد کے لیے آگے بڑھ جاتے ہیں اور جہاں پیچھے رہنے والوں کو چھوڑ نہیں دیا جاتا بلکہ بیسیوں ہاتھ اس کی مدد کے لیے آگے بڑھ جاتے ہیں اور جہاں پیچھے رہنے والوں کو چھوڑ نہیں دیا جاتا بلکہ سہارا دے کر آگے بڑھایا جاتا ہے۔ یہ معاشرہ فرد کو مشکلات کا مقابلہ کرنے کے لائق بناتا ہے اور گرتوں کو تھامنے کا کام انجام دیتا ہے۔

تحریکِ اسلامی کے کارکنوں کے لیے یہ امر بنیادی اہمیت رکھتا ہے کہ وہ ان بنیادوں کو خوب اچھی طرح سمجھ لیں جن پر اسلام اجتماعی تعلقات کو استوار کرتا ہے اور پھر اپنی قوتوں کو اس مقصد کے حصول کے لیے استعمال کریں۔

ہمارے محترم دوست اور عزیز بھائی خرم جاہ مراد نے تحریک اسلامی کے کارکنوں کی اسی بنیادی ضرورت کو پورا کرنے کے لیے یہ رسالہ مرتب کیا ہے۔ خرم صاحب نے مغربی تعلیم کے

باوجود دینی علم کے حصول کی نمایاں کوشش کی اور قابلِ رشک کامیابی حاصل کی۔ اگر پھول اپنی خوشبو سے پہچانا جاتا ہے تو ان کی تالیف ہمیں فکر اور مزاج کو سمجھنے میں بڑی مدد دیتی ہے۔

دراصل زیرِ بحث مسئلہ کے تین پہلو ہیں۔

اول: اسلام اس اجتماعی زندگی کو برپا کرنے اور قائم رکھنے کے لیے فرد کی سیرت میں کن بنیادی خصوصیات کو جلوہ گر دیکھنا چاہتا ہے۔

دوم: ان بنیادوں کو منہدم کرنے والی اور ان کو کمزور کرنے والی چیزیں کون سی ہیں تاکہ ان سے بچا جائے۔

سوم: ان بنیادوں کو مضبوط کرنے والی اور ان کو ترقی دینے والی صفات کون سی ہیں تاکہ انھیں اختیار کیا جائے۔

مصنف محترم نے انہی تین سوالات کے جواب نہایت شرح وبسط کے ساتھ دیئے ہیں اور ہمیں توقع ہے کہ اگر تحریکِ اسلامی کے کارکن ان کو پورے غور سے پڑھیں اور ان کو اختیار کرنے کی کوشش کریں تو وہ اپنی اجتماعی زندگی کو ایمان، محبت اور ایثار کے ان پھولوں سے آراستہ کرلیں گے جو گلشنِ حیات کو آشنائے بہار کرتے ہیں۔

اس کتاب سے استفادہ کے سلسلہ میں ایک بات رفقاء کے پیشِ نظر رہے تمام چیزیں انسان فوراً ہی حاصل نہیں کرسکتا۔ تعمیرِ سیرت کے منصوبہ کی پوری اسکیم کو سمجھ لینے کے بعد ہمیں چاہیے کہ ایک ایک چیز لیں۔ اسے خوب ذہن نشین کرلیں اور پھر اس کو اختیار کرنے کی کوشش کریں اور اسی طرح ایک کے بعد دوسری اور دوسری کے بعد تیسری چیز لیتے جائیں۔

حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہٗ کے متعلق روایت ہے کہ آپ نے سورۂ بقرہ سات آٹھ سال میں مطالعہ کی تھی، جب آپ سے استفسار کیا گیا تو آپ نے جواب دیا کہ میں ایک چیز کو پڑھتا ہوں۔ اس کو اختیار کرتا ہوں اور پھر آگے بڑھتا ہوں۔ حقیقت یہ ہے کہ تعمیرِ سیرت کے لیے اسی تدریجی مسلسل اور انتھک کوشش کی ضرورت ہوتی ہے۔ محض مطالعہ اس کے لیے کافی نہیں ہے، یہ مقصد تو پیہم سعی وجہد سے حاصل ہوگا۔ پھر خوب یاد رکھیے کہ یہ راہ نشیب و فراز کی راہ ہے۔ اور کامیابی کا راز ہمت اور اعتماد کے ساتھ جدوجہد میں مضمر ہے۔ ناکامیاں آئیں گی مگر ان کا مقابلہ کرنا ہے۔ مشکلات دعوتِ مبارزت دیں گی، مگر انہیں انگیز کرنا ہے وقتیں

پیش آئیں گی مگر ان سے لڑنا ہے اور ان کو شکست دینا ہے۔ یہ تو اس راہ کے لازمی مراحل ہیں۔ کیا ان سے شکستہ خاطر ہو جائیں۔

جوئے خوں سر سے گزر ہی کیوں نہ جائے
آستانِ یار سے اٹھ جائیں کیا؟

خورشید احمد

اسلامی تحریک میں
کارکنوں کے باہمی تعلقات

اسلامی تحریک ایک اجتماعی انقلاب کی داعی ہوتی ہے اس لیے اس کا یہ فریضہ بالکل اولین اہمیت کا حامل ہے کہ وہ اپنے کارکنوں کو عام طور پر تمام انسانوں سے اور خاص طور پر باہم ایک دوسرے کے ساتھ ساتھ صحیح صحیح بنیادوں پر مربوط کردے۔ اسلامی تحریک کے کارکنوں کے باہمی تعلقات کو قرآن اس طرح ظاہر کرتا ہے کہ:-

اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ اِخْوَةٌ (الحجرات:۱۰) ''مومنین تو آپس میں بھائی بھائی ہیں۔''

اگرچہ بظاہر یہ صرف تین الفاظ کا ایک مختصر سا فقرہ ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ باہمی تعلقات کی بنیاد، اصولی حیثیت، اہمیت اور گہرائی ظاہر کرنے کے لیے یہ بالکل کافی ہے اور اس معاملہ میں اسے ایک اسلامی تحریک کے چارٹر کی حیثیت دی جاسکتی ہے۔

اس سے ایک طرف تو یہ ظاہر ہوتا ہے کہ اسلامی تحریک میں افراد کا باہم دگر رشتہ ایک اصولی رشتہ ہوتا ہے۔ یہ عقیدہ اور فکر کی یگانگت کی بنیاد پر قائم ہوتا ہے۔ اور نصب العین کی یکسانیت اس کی بنیاد بنتی ہے یعنی یہ ایمان کا اشتراک ہوتا ہے جو اس میں رنگ بھرتا ہے۔ اور دوسری طرف یہ کہ اصولی رشتہ ہونے کی بنا پر یہ کوئی روکھا سوکھا رشتہ نہیں ہوتا بلکہ اس میں استحکام گہرائی اور شدید محبت سموئی ہوتی ہے۔ اس کو صرف دو بھائیوں کا باہمی تعلق ہی ظاہر کرسکتا ہے اور یہی تعلق ہے جو اخوت کہلاتا ہے۔ ایک اصولی رشتہ کو اسلام جو وسعت و استحکام اور جذبات بخشتا

ہے اس کی ترجمانی کے لیے ''اخوۃ'' سے بہتر اور کیا لفظ ہوسکتا تھا۔

اسلامی تہذیب میں ایمان کا تصور صرف اتنا ہی نہیں کہ انسان چند مابعد الطبیعی حقائق کا اقرار کرلے اور بس۔ بلکہ یہ ایک ہمہ گیر حیثیت کا حامل ہے یہ ایک عقیدہ ہے جو قلب پر چھا جاتا ہے اور رگوں میں خون کی طرح گردش کرنے لگتا ہے۔ یہ ایک جذبہ ہے جو سینہ کو مضطرب و متلاطم رکھتا ہے، ایک فکر ہے جو ذہن و دماغ کا سانچہ ہی بدل دیتا ہے۔ ایک عملی نظام کی قوتِ نافذہ جو تمام اعضاء و جوارح کو اپنے تسلط میں لے کر پوری انفرادی اور اجتماعی زندگی میں انقلاب لے آتی ہے جو ایمان اتنا وسیع الاثر ہو اس کی گرفت سے انسانوں کے باہمی تعلقات کس طرح آزاد ہوسکتے ہیں، جب کہ یہ حقیقت ہے کہ انسان کی پوری زندگی سوائے ایک بہت معمولی جزو کے عبارت ہے انسان اور انسان کے باہمی تعلقات سے اس لیے یہ ایمان اپنے ماننے والوں کو تمام انسانوں سے عموماً اور ایک دوسرے سے خصوصاً تعلقات قائم کرنے کی ہدایت کرتا ہے۔ اور پھر ایک طرف ان تعلقات کو عدل و احسان کی بنیاد قائم کرنے کے لیے وہ ایک اجتماعی نظامِ حیات اور ایک تہذیب کی صورت گری کرتا ہے اور دوسری طرف حقوق و فضائل پر مشتمل ایک ضابطہ تجویز کرکے دیتا ہے تاکہ ہر فرد اپنے اپنے مقام پر اس کو عمل میں لائے اور اس طرح جو لوگ رشتۂ ایمان میں منسلک ہوں وہ ایک دوسرے سے اس طرح جڑ جائیں جیسے ایک ہاتھ کی انگلیاں دوسرے ہاتھ سے جڑ جاتی ہیں یا جس طرح ایک بھائی دوسرے بھائی سے جڑا ہوتا ہے۔ اور یہ اس ایمان کی اصولی حیثیت کا لازمی تقاضا ہے جس کے لیے انسانی فطرت مطالبہ کرتی ہے اور جس پر عقل شہادت دیتی ہے۔

جو لوگ ہر رنگ اتار کر صرف اللہ کے رنگ میں رنگ جاتے ہیں تمام اطاعتیں ترک کرکے صرف اللہ کی اطاعت کرتے ہیں۔ ہر باطل سے کٹ کر صرف حق سے جڑ جاتے ہیں اور صرف اللہ کی اطاعت کرتے ہیں۔ ہر باطل سے کٹ کر صرف حق سے جڑ جاتے ہیں اور صرف اللہ کے لیے یکسو ہوجاتے ہیں وہ بھی اگر ایک دوسرے سے مربوط نہ ہوں گے، متعلق نہ ہوں گے اور محبت کے تعلقات قائم نہ کریں گے تو پھر کون کرے گا؟ نصب العین کے لیے یکسوئی سے زیادہ بڑی کون سی قوت ہے جو انسان کو انسان سے جوڑ سکتی ہے؟ اس یکسوئی کا ایک ایک تقاضا اور راہِ حق کی ایک ایک منزل اس تعلق کو ایک زندہ حقیقت میں تبدیل کرتی چلی جاتی ہے۔ جو آدمی صرف حق

کے لیے خود کو وقف کر دے، پھر وہ اس راہ پر چلنے والوں میں سے ایک ایک کی محبت، ہمدردی، تسلی اور سہارے کا ضرورت مند اور محتاج ہوتا ہے اور اگر اس راستے پر اسے یہ نعمت بھی نہ ملے تو یہ اتنی بڑی کمی ہوگی کہ جس کی تلافی کسی طرح بھی ممکن نہ ہوگی۔

اس دنیا میں ایمان کا اصل مقصد۔ یعنی عالمگیر اسلامی انقلاب اور اسلامی تہذیب کا قیام خود ایک انتہائی مستحکم اور برادرانہ تعلق کا تقاضا کرتا ہے اس مقصد کا حصول کوئی آسان کام نہیں۔ یہ شہادت گہ الفت میں قدم رکھنے کے مترادف ہے جہاں قدم قدم پر مصائب کی آندھیاں اٹھتی ہیں اور آزمائشوں کے سیلاب آتے ہیں۔ ظاہر ہے اس گراں بار ذمہ داری کی ادائیگی کے لیے ایک ایک فرد کی رفاقت انتہائی قیمتی ہے جس کا فقدان کسی قیمت پر برداشت نہیں کیا جاسکتا۔ خصوصاً جب کہ یہ بھی معلوم ہو کہ قلتِ اعوان وانصار اس راہ کا ایک کلیہ ہے۔

پھر کوئی اجتماعی انقلاب بغیر ایک منظم اور طاقتور جماعت کے ظہور پذیر نہیں ہوسکتا اور ایک منظم اور طاقتور جماعت اس وقت وجود میں آتی ہے جب اس کے افراد ایک دوسرے سے جڑے ہوئے ہوں۔ جب ہی اس مقصد کے لیے اتنے منظم طریقے پر جدوجہد کی جاسکتی ہے جیسے کوئی سیسہ پلائی ہوئی دیوار ہو كَأَنَّهُمْ بُنْيَانٌ مَّرْصُوصٌ ۝ (الصف:۴) جس میں کسی رخنہ اور انتشار کو راہ نہ ملے۔ اور ایسا نظمِ جدوجہد ہی کامیابی کا ضامن ہے۔

اللہ تعالیٰ نے سورۂ آل عمران میں ایک نوزائیدہ اسلامی ریاست کے چلانے والوں کو اس ربط کی ہدایت اس طرح کی ہے:

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا اصْبِرُوا وَصَابِرُوا وَرَابِطُوا ۖ وَاتَّقُوا اللَّهَ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُونَ ۝ (آل عمران:۲۰۰)

اے ایمان لانے والو! صبر سے کام لو، باطل پرستوں کے مقابلہ میں پامردی دکھاؤ۔ حق کی خدمت کے لیے کمربستہ رہو اور اللہ سے ڈرتے رہو، امید ہے کہ فلاح پاؤ گے۔

سورۂ انفال کے آخر میں اسلامی انقلاب کی تکمیل کے لیے مسلمانوں کے باہمی تعلقات کو اس کے لیے ایک لازمی شرط کے طور پر سامنے رکھا گیا ہے اور یہ کہا گیا ہے کہ جو لوگ اس دین پر ایمان لائیں، اس کی خاطر ہر چیز ترک کر دیں اور اس جدوجہد میں سردھڑ کی بازی

لگادیں، ان کا رشتہ ایک دوسرے کے ساتھ لازماً دوستی و محبت کا رشتہ ہے اور اس رشتہ کے لیے یہاں ولایت کی اصطلاح استعمال کی گئی ہے۔

اِنَّ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَهَاجَرُوْا وَ جٰهَدُوْا بِاَمْوَالِهِمْ وَاَنْفُسِهِمْ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ وَ الَّذِیْنَ اٰوَوْا وَّنَصَرُوْٓا اُولٰٓئِكَ بَعْضُهُمْ اَوْلِیَآءُ بَعْضٍ ؕ (انفال:۷۲)

جن لوگوں نے ایمان قبول کیا اور ہجرت کی اور اللہ کی راہ میں اپنی جانیں لڑائیں اور اپنے مال کھپائے اور جن لوگوں نے ہجرت کرنے والوں کو جگہ دی اور ان کی مدد کی، وہی دراصل ایک دوسرے کے ولی ہیں۔

اور اس سے آگے چل کر کفار کی تنظیم اشتراک اور ان کی جماعتی قوت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے یہ کہا گیا ہے کہ اگر مسلمانوں نے یہ رشتۂ ولایت پیدا نہ کیا تو عدل و احسان اور خدا پرستی کی بنیاد پر ایک عالمگیر اسلامی انقلاب کی تمنا کبھی ٹھوس زمین میں جڑ نہ پکڑ سکے گی اور نتیجتاً خدا کی یہ زمین فتنہ و فساد سے بھر جائے گی۔ کیونکہ مسلمان بغیر اس رشتۂ ولایت کے انقلاب کی مخالف طاقتوں سے عہدہ برآ نہیں ہو سکتے۔

وَ الَّذِیْنَ كَفَرُوْا بَعْضُهُمْ اَوْلِیَآءُ بَعْضٍ ؕ اِلَّا تَفْعَلُوْهُ تَكُنْ فِتْنَةٌ فِی الْاَرْضِ وَ فَسَادٌ كَبِیْرٌ ﴿۷۳﴾ (انفال:۷۳)

اور جو لوگ منکرِ حق ہیں وہ ایک دوسرے کی حمایت کرتے ہیں۔ اگر تم (اہل ایمان ایک دوسرے کی حمایت) نہ کرو گے تو زمین میں فتنہ و فساد برپا ہوگا۔

اور ظاہر ہے کہ اسلامی تہذیب کے قیام اور اسلامی انقلاب کے لیے یہ جدوجہد اسی ایمان کا اصل معیار ہے۔

وَ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَ هَاجَرُوْا وَ جٰهَدُوْا فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ وَالَّذِیْنَ اٰوَوْا وَّنَصَرُوْٓا اُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُؤْمِنُوْنَ حَقًّا ؕ (انفال:۷۴)

جو لوگ ایمان لائے اور جنھوں نے اللہ کی راہ میں گھر بار چھوڑے اور جدوجہد کی اور جنھوں نے پناہ دی اور مدد کی وہی سچے مومن ہیں۔

اس سے کچھ پیشتر اللہ تعالیٰ نے مخالفین کی تدابیر کے مقابلے میں اپنی نصرت کے وعدہ کے ساتھ جس چیز سے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی ڈھارس بندھائی ہے وہ مومنین کی جماعت ہے کہ جس کے دلوں کو اللہ تعالیٰ نے جوڑ دیا اور جو اسلامی انقلاب کی ضمانت ہے۔

هُوَ الَّذِيْٓ اَيَّدَكَ بِنَصْرِهٖ وَ بِالْمُؤْمِنِيْنَ ۝ وَاَلَّفَ بَيْنَ قُلُوْبِهِمْ ۭ (انفال: ۶۲، ۶۳)

وہی تو ہے جس نے اپنی مدد سے اور مومنوں کے ذریعہ سے تمہاری تائید کی اور مومنوں کے دل ایک دوسرے کے ساتھ جوڑ دیئے۔

اسلامی انقلاب کے داعیوں کا یہ باہمی تعلق اخوت کا تعلق ہے، ولایت کا تعلق ہے، رحمت کا تعلق ہے اور محبت کا تعلق ہے۔ لیکن اخوت کا لفظ بڑا اہمہ گیر ہے جو اپنے دامن میں سب کچھ سمیٹ لیتا ہے۔ اسلامی تحریک کے کارکنوں کو آپس میں اس طرح جڑنا چاہیے جس طرح دو بھائیوں کا رشتہ ایک ناقابلِ شکست رشتہ ہوتا ہے اور وہ اپنے درمیان کوئی اختلافی تفرقہ، فساد یا انتشار برداشت نہیں کر سکتے۔ جس طرح وہ ایک دوسرے کے لیے اپنا سب کچھ قربان کر دینے کے لیے تیار ہوتے ہیں۔ ایک دوسرے کی خیر خواہی، اعانت اور مدد میں لگے رہتے ہیں اور ایک دوسرے کے لیے پشت پناہ اور سہارا بنتے ہیں۔ جس طرح وہ ایک دوسرے کے دکھ درد میں شریک ہوتے ہیں اور اپنے معاملات میں پورے اعتماد کے ساتھ ایک دوسرے کو شریک کرتے ہیں اور جس طرح ان کے درمیان ایک شدید جذبۂ محبت ہوتا ہے جو ان کے سینوں میں موجزن رہتا ہے اور ان کے دلوں کو حرارت بخشتا ہے، ٹھیک اسی طرح راہِ حق کے ان مسافروں کا تعلق ہوتا ہے جو دین کے لیے اپنا پورا سرمایۂ زندگی لگا دیتے ہیں۔ جسے اسلامی انقلاب سے جتنی گہری لگن ہوگی وہ اتنا ہی گہرا تعلق اپنے ساتھی سے قائم کرے گا اور جسے جتنا زیادہ مقصد عزیز ہوگا اسے اتنا ہی یہ تعلق عزیز ہوگا۔ کیونکہ یہ تعلق خالصۃً للہ فی اللہ ہوتا ہے۔ صرف اللہ کے لیے اور صرف اللہ کی راہ میں جو شخص اسلامی انقلاب کا سرگرم داعی ہو اور اس کا تعلق اپنے ساتھیوں سے ایسا ہو، جیسا راہ چلتے اجنبی سے تو اسے اپنے بارے میں غور کرنا چاہیے کہ وہ کس راہ پر جا رہا ہے اور اگر اسے اپنے ان ساتھیوں سے تعلق کی بس اتنی ہی قدر ہو جتنی اس گرد کی جو آدمی اپنے اوپر سے جھاڑ دیتا ہے تو پھر

اسے سوچنا پڑے گا کہ اس کے دل میں خود اس مقصد کی کتنی قدر ہے جس کی محبت کا وہ دعویٰ کرتا ہے۔

اخوت کا یہ وہ تعلق ہے جس کے لیے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ''اَلْحُبُّ لِلّٰہِ'' کی پاکیزہ جامع اور قلب کو مسخر کر دینے والی اصطلاح استعمال کی ہے۔ محبت خود ایک بڑی پرکشش اور شیریں اصطلاح ہے اور پھر للہ اور فی اللہ کی قید اسے تمام آلودگیوں اور ناگواریوں سے پاک کر کے رفعت کے انتہائی درجات تک پہنچا دیتی ہے اور اس طرح یہ اصطلاح بیک وقت عقل اور دل کو وہ پیمانہ دیتی ہے جس پر ہر مومن اپنے تعلق کو ناپ سکتا ہے۔

اللہ پر ایمان کا اور اس کی راہ میں محبت کا بالکل لازم و ملزوم کا سا تعلق ہے جہاں ایک چیز ہوگی وہاں دوسری بھی موجود ہوگی۔ ایک نہ ہوگی تو دوسری بھی مشکوک ہوگی۔ چنانچہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک جگہ اس کا اظہار یوں کیا کہ:

لَا تُؤْمِنُوْا حَتّٰی تَحَابُّوْا۔ (عن ابی ہریرۃ فی المسلم بحوالہ ص: ۱۹۷)

''تم اس وقت تک مومن نہ ہوگے جب تک آپس میں ایک دوسرے سے محبت نہ کرو''

اور پھر پورے تعلقات کو اس بنیاد پر قائم کرنے اور اپنی محبت اور دشمنی کو اللہ کے لیے خالص کر لینے کو تکمیل ایمان کی شرط ٹھہرایا:

مَنْ اَحَبَّ لِلّٰہِ وَاَبْغَضَ لِلّٰہِ وَاَعْطٰی لِلّٰہِ وَمَنَعَ لِلّٰہِ فَقَدِ اسْتَکْمَلَ الْاِیْمَانَ۔

جس نے محبت کی تو صرف اللہ کے لیے اور دشمنی کی تو صرف اللہ کے لیے، کسی کو کچھ دیا تو اللہ کے لیے اور روکا تو اللہ کے لیے، اس نے اپنا ایمان مکمل کر لیا۔

دوستیاں اور دشمنیاں انسان کی زندگی پر واقعی اس طرح اثر انداز ہوئی ہیں کہ ان کا اللہ کے لیے خالص کر لینا تکمیل ایمان کے لیے اگر ضروری شرط ٹھیرایا گیا ہے تو بالکل منطقی اور بدیہی بات ہے۔ ایمان کی بہت سی شاخیں ہیں۔ ہر شاخ اپنی جگہ اہمیت کی حامل ہے۔ اللہ کے لیے محبت ایک معاشرہ کے استحکام اور حسن و جمال کے لیے اور اسلامی انقلاب کے لیے ایک منظم طاقت بروئے کار لانے کے لیے جس طرح ضروری ہے کہ اس کے پیش نظر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کو ایک جگہ تمام اعمال سے افضل قرار دیا۔ حضرت ابوذرؓ روایت کرتے ہیں کہ:

خَرَجَ عَلَيْنَا رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَقَالَ اَتَدْرُوْنَ اَیُّ الْاَعْمَالِ اَحَبُّ اِلَى اللّٰهِ تَعَالٰى قَالَ قَائِلٌ الصَّلٰوةُ وَالزَّكٰوةُ وَقَالَ قَائِلٌ الْجِهَادُ ۔قَالَ النَّبِیُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: اِنَّ اَحَبَّ الْاَعْمَالِ اِلَى اللّٰهِ تَعَالٰى اَلْحُبُّ لِلّٰهِ وَالْبُغْضُ لِلّٰهِ۔ (ابی درداء)

ایک دفعہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہمارے پاس آئے اور پوچھا کیا جانتے ہو، اعمال میں سے کون سا عمل اللہ تعالیٰ کو سب سے زیادہ محبوب ہے؟ کسی نے نماز وزکوٰۃ کہا اور کسی نے جہاد کو۔ آپؐ نے فرمایا کہ صرف اللہ کے لیے محبت اور اللہ کے لیے دشمنی، اللہ کے نزدیک تمام اعمال میں محبوب ترین ہے۔ (ابودرداء)

پھر ایک دفعہ حضرت ابوذرؓ کو مخاطب کرتے ہوئے آپؐ نے سوال کیا کہ:

اَیُّ عُرَى الْاِیْمَانِ اَوْ ثَقُ؟ قَالَ اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗ اَعْلَمُ قَالَ: اَلْمُوَالَاةُ فِی اللّٰهِ وَالْحُبُّ لِلّٰهِ وَالْبُغْضُ لِلّٰهِ۔ (بیہقی)

ایمان کی کون سی کڑی مضبوط ترین ہے؟ جواب دیا کہ خدا اور اس کے رسولؐ زیادہ بہتر جانتے ہیں۔ آپ نے کہا کہ اللہ کی راہ میں دوستی اور اس کی راہ میں محبت اور دشمنی (بیہقی)

عُرٰی حلقہ کو بھی کہتے ہیں اور اس درخت کو بھی جس کے پتے خزاں میں نہیں جھڑتے، اور برتنوں کے دستہ کو بھی کہتے ہیں جس کو پکڑ کر برتن اٹھایا جاتا ہے۔ یعنی یہ کہ اللہ کی راہ میں محبت وہ مضبوط سہارا ہے جس کے بل پر آدمی ایمان کے تقاضے پورے کرسکتا ہے۔ ایسا سہارا جو کبھی نہ ٹوٹ سکتا ہے اور نہ دھوکا دے سکتا ہے۔

بات یہ ہے کہ ایمان آدمی کی پوری زندگی کا مطالبہ کرتا ہے یعنی زندگی کا ہر لمحہ اس وقت تک جب تک کہ جسم میں سانس آرہی ہے اور جارہی ہے، ایمان کے تقاضوں کے مطابق گزرنا چاہیے۔ زندگی میں اتنی وسعت کے ساتھ عمل صالح اس وقت تک وجود پذیر نہیں ہوسکتا جب تک کہ مومن کے تعلقات اللہ کے لیے محبت کے تعلقات نہ ہوں، اس لیے بھی کہ تعلقات آدمی کی زندگی کا بہت بڑا حصہ ہیں اور اس لیے بھی کہ یہ تعلقات اس کی زندگی کو لازماً متاثر کرتے ہیں اور

ایک طرح اس کی دوستیاں اس کے لیے دین کا معیار بن جاتی ہیں۔ چنانچہ ایک طرف تو اللہ تعالیٰ مسلمانوں کو نصیحت کرتا ہے کہ اپنے نفس و ذات کو ان لوگوں کے ساتھ وابستہ رکھیں جن کی زندگیوں میں خدا کی یاد رچی بسی ہو، اور اس کے لیے صبر کا لفظ استعمال کرتا ہے تاکہ وہ حق کی راہ پر چل سکیں اور ساتھ ہی اپنی نظروں کو دنیوی ساز و سامان اور آرائش سے متاثر ہو کر بھٹکنے نہ دیں۔

وَاصْبِرْ نَفْسَكَ مَعَ الَّذِيْنَ يَدْعُوْنَ رَبَّهُمْ بِالْغَدٰوةِ وَالْعَشِيِّ يُرِيْدُوْنَ وَجْهَهٗ وَلَا تَعْدُ عَيْنٰكَ عَنْهُمْ تُرِيْدُ زِيْنَةَ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا۔ (کہف)

اور اپنی ذات کو ان لوگوں کے ساتھ ٹھیراؤ جو صبح و شام اپنے رب کو پکارتے ہیں اور اس کی خوشنودی کے طالب ہیں اور دنیوی زندگی کی خواستگاری میں تمہاری نگاہیں ان سے ہٹ کر اور طرف نہ دوڑیں۔

اور دوسری طرف ہمارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم متنبہ کرتے ہیں کہ انسان اپنی دوستی کے تعلقات سوچ سمجھ کر قائم کرے اس لیے کہ:

اَلْمَرْءُ عَلٰى دِيْنِ خَلِيْلِهٖ فَلْيَنْظُرْ اَحَدُكُمْ مَنْ يُّخَالِلُ۔

(احمد، ترمذی، ابوداؤد، بیہقی)

آدمی اپنے خلیل کے دین پر ہوتا ہے پس تم میں سے ہر ایک سوچ سمجھ لے کہ وہ اپنا خلیل کس کو بناتا ہے۔ (عن ابی ہریرہؓ)

خلیل کا لفظ خلّت سے نکلا ہے جس سے مراد ایسی محبت اور خلوص ہے جو دل میں اتر کر رچ بس جائے۔ اچھے اور برے لوگوں کی محبت اور صحبت کی ایک عمدہ تمثیل حدیث میں بیان ہوئی ہے۔ فرمایا گیا ہے کہ اچھی صحبت کی مثال ایسی ہے جیسے کسی عطر فروش کی ہم نشینی کی جائے۔ اگر عطر نہ بھی ملے تب بھی خوشبو سے تو دل و دماغ تر و تازہ ہوگا اور بُری صحبت کو لوہار کی دوکان سے تشبیہہ دی گئی ہے جس میں اگر کپڑے جلنے سے بچ گئے تب بھی کالک اور دھواں تو طبیعت کو پراگندہ کرے گا ہی۔

ایمان کا ایک اسٹیج وہ ہوتا ہے جب آدمی خود ایمان اور ایمان کے عملی مطالبات کی

ادائیگی میں بھی ایک خاص لذت اور کیف و سرور محسوس کرتا ہے اور پھر عمل صالح کا مطالبہ اس لذت کی وجہ سے آدمی کے اندر سے اٹھتا ہے۔ اس کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حلاوت ایمان سے تعبیر کیا ہے اور اس کی تین شرائط بیان کرتے ہوئے اس میں ایک چیز یہ بھی رکھی ہے کہ:

اَنْ یُّحِبَّ الْمَرْءُ لَایُحِبُّهٗ اِلَّا لِلّٰهِ ط

کہ وہ آدمی محبت کرے اور یہ محبت سوائے اللہ کے کسی اور کے لیے نہ ہو۔

ایک غلام اور بندہ کو اپنے آقا و مالک کی محبت اگر نصیب ہو جائے تو اس سے بڑھ کر اور کیا خوش قسمتی ہو سکتی ہے۔

ایک مومن کو اگر اللہ کی محبت مل جائے تو اس کی اس دولت کا بدل اس کو کیا مل سکتا ہے: یہ وہ محبت ہے جو ایک مومن کی معراج ہوتی ہے اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم ہم کو بتاتے ہیں کہ جو لوگ اللہ کے لیے ایک دوسرے سے تعلقاتِ اخوت قائم کریں وہ اس نعمتِ عظمیٰ کے مستحق ہوتے ہیں۔ چنانچہ حضرت معاذ بن جبلؓ یہ کہتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا ہے کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ:

سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَقُوْلُ قَالَ اللّٰهُ تَعَالٰى وَجَبَتْ مَحَبَّتِيْ لِلْمُتَحَابِّيْنَ فِيَّ الْمُتَجَالِسِيْنَ فِيَّ وَالْمُتَزَاوِرِيْنَ فِيَّ وَالْمُتَبَادِلِيْنَ فِيَّ.

میری محبت ان لوگوں کے لیے واجب ہوگئی جو میرے لیے آپس میں محبت کریں، میرے لیے ساتھ مل کر بیٹھیں، میرے لیے ایک دوسرے سے ملنے جائیں اور میرے لیے ایک دوسرے پر مال خرچ کریں۔

دنیوی زندگی میں تو اللہ کے لیے محبت کے یہ سب نتائج ہیں ہی لیکن آخرت میں جب آدمی کے لیے ایک ایک عمل قیمتی ہوگا اس وقت ایک کھجور کا صدقہ اور ایک اچھی بات بھی اس کے لیے بسا غنیمت ہے۔ اس وقت یہ تعلق ایک مومن کے لیے انتہائی بلند درجات کا موجب ہوگا۔ اور اسلامی انقلاب کے ضمن میں اس تعلق کی اہمیت پر جو کچھ ہمیں معلوم ہے اس کے پیش نظر یہ بالکل فطری اور لازمی بات ہے۔

اس دن کسی آدمی کو دوسرے کا ہوش نہ ہوگا۔ آدمی اپنے ماں باپ، بھائی بہن، بیوی بچے سب سے دور بھاگے گا۔ آگ سے بچنے کی خاطر ان سب کو فدیہ میں دے دینے کو تیار ہوگا۔ دوستی کی تمام حقیقتیں کھل جائیں گی اور دوست دوست کا دشمن ہو جائے گا۔ وہی دوست جس کی محبت دنیا میں دل و دماغ میں سرایت کیے ہوئے تھی۔ لیکن صرف متقین ہوں گے جن کی دوستیاں وہاں قائم رہیں گی۔ اس لیے اس نازک مرحلہ میں معلوم ہوگا اور اس کا صحیح احساس و اندازہ ہوگا کہ دنیا میں ان دوستیوں نے کیا کچھ بخشا جو آج کام آ رہا ہے۔

اَلْاَخِلَّآءُ يَوْمَئِذٍۢ بَعْضُهُمْ لِبَعْضٍ عَدُوٌّ اِلَّا الْمُتَّقِيْنَ ۝ يٰعِبَادِ لَا خَوْفٌ عَلَيْكُمُ الْيَوْمَ وَلَآ اَنْتُمْ تَحْزَنُوْنَ ۝ (الزخرف: ۶۷، ۶۸)

جو آپس میں ایک دوسرے کے دوست تھے اس روز ایک دوسرے کے دشمن ہو جائیں گے۔ سوائے متقین کے، اے میرے بندو! آج کے دن تم پر کوئی خوف نہیں اور نہ تم غمگین ہوگے۔

اور اس طرح آدمی کا انجام انھیں لوگوں کے ساتھ ہوگا جن کے ساتھ اس کے محبت کے تعلقات ہوں گے۔ یہاں تک کہ خدا کے لیے محبت کرنے والوں میں اگر ایک مشرق میں رہتا ہوگا اور دوسرا مغرب میں تو خداوند تعالیٰ ان کو قیامت کے دن وہاں جمع کر کے کہے گا: ''وہ شخص یہ ہے جس سے تو محبت رکھتا تھا۔''

۱- اَلْمَرْءُ مَعَ مَنْ اَحَبَّ۔ (عَنْ ابی موسیٰ اشعری فی البخاری)

(المسلم بحوالہ ص: ۱۸۲)

۲- لَوْ اَنَّ عَبْدَيْنِ تَحَابَّانِي اللّٰهِ عَزَّوَجَلَّ وَاحِدٌفِي الْمَشْرِقِ وَاٰخرفِي الْمَغْرِبِ لَجَمَعَ اللّٰهُ بَيْنَهُمَا يَوْمَ الْقِيَامَةِ يَقُوْلُ هٰذَالَّذِيْ كُنْتُ تُحِبُّهُ فِيَّ۔

وہ ایسا دن ہوگا جب قدموں تلے آگ ابل رہی ہوگی اور سر کے اوپر آگ کا بادل ہوگا جس سے انگارے برس رہے ہوں گے۔ دائیں بائیں آگے پیچھے سے آگ کی لپٹیں رخساروں کو چھو رہی ہوں گی اور صرف ایک سایہ ہوگا جہاں انسان پناہ حاصل کر سکے گا، اور وہ عرش الٰہی کا سایہ

ہوگا۔ جو سات قسم کے آدمی اس دن اس سائے میں ہوں گے، ان کے بارے میں اللہ کے رسولؐ نے ہم کو خبر دی ہے اور بتایا ہے کہ ان میں:

رَجُلَانِ تَحَابَّافِی اللّٰہِ اِجْتَمَعَا عَلَیْہِ وَتَفَرَّقَا عَلَیْہِ۔

(رواہ ابوہریرۃ فی البخاری والمسلم بحوالہ ص:۱۹۱)

دو آدمی وہ ہوں گے جنھوں نے اللہ کے لیے آپس میں محبت کی، اس کے لیے جمع ہوئے اور اس کے لیے علیحدہ ہوئے۔

اور ان پر خدا کی رحمت ہو کہ انھوں نے ہم تک اللہ کا یہ فرمان بھی پہنچایا کہ:

اِنَّ اللّٰہَ تَعَالٰی یَقُوْلُ یَوْمَ الْقِیَامَۃِ اَیْنَ الْمُتَحَابُّوْنَ فِیَّ؟ بِجَلَالِیْ الْیَوْمَ اُظِلُّھُمْ فِی ظِلِّیْ یَوْمَ لَا ظِلَّ اِلَّا ظِلِّیْ۔

(عن ابی ہریرۃ فی المسلم بحوالہ ص:۴۲۵)

اللہ تعالیٰ قیامت کے دن کہے گا: کہاں ہیں وہ جو میری عظمت کی خاطر آپس میں محبت کرتے تھے۔ آج کے دن میں انھیں اپنے سائے میں جگہ دوں گا اور آج کے دن سوائے میرے سائے کے کوئی سایہ نہیں ہے۔

اور ان کے لیے وہ کیا ہی بلند درجات ہوں گے جن کی اطلاع اللہ تعالیٰ نے یوں دی ہے کہ:

اَلْمُتَحَابُّوْنَ بِجَلَالِیْ لَھُمْ مَنَابِرُ مِنْ نُوْرٍ یَغْبِطُھُمُ النَّبِیُّوْنَ وَالشُّھَدَآءُ۔ (عن معاذ بن جبل فی الترمذی ص:۴۳۶)

جو میری عظمت کی خاطر آپس میں محبت کرتے ہیں ان کے لیے آخرت میں نور کے منبر ہوں گے اور انبیاء و شہداء ان پر رشک کریں گے۔

اللہ کے لیے اور ایمان کی بنیاد پر باہم یہ گہرے مستحکم اور محبت کے جذبات سے لبریز تعلقات اسلامی تحریک کے لیے اتنے اہم ہیں کہ ان کی خرابی کو انتہائی تشویش کی نگاہوں سے دیکھا گیا ہے۔ انقطاعِ تعلق کے بارے میں جو سخت تنبیہات آئی ہیں، باہم صلح کرنے اور کرانے کے لیے جو وعدے آئے ہیں اور تعلقات خراب کرنے والوں کے بارے میں جو کچھ کہا گیا ہے

اس پر تفصیلی گفتگو تو آگے آئے گی۔ لیکن یہ بات ذہن میں رہنا ضروری ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے باہمی تعلقات کی خرابی اور بغض کو ایک ایسے استرے سے تشبیہہ دی ہے جو پورے دین کو مونڈ کر صاف کر دے۔

هِيَ الْحَالِقَةُ لَا اَقُوْلُ تَحْلِقُ الشَّعْرَ وَلٰكِنْ تَحْلِقُ الدِّيْنَ۔ (عن ابی درداء فی احمد و ترمذی ص: ۱۴۲ دم)

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس تعلق کے اثرات کتنے ہمہ گیر ہوتے ہیں جو لوگ بھی خلوصِ دل سے اس دین سے منسلک ہوں گے ان کے قلب سے اپنے ساتھیوں کے لیے لازماً محبت کے چشمے ابلنے لگیں گے اور یہ تعلق اتنا عزیز ہوگا اور ان کے سینوں میں اس کی اتنی قدر و قیمت ہوگی کہ وہ کوئی سا نقصان برداشت کر لیں گے۔ لیکن اس کا زیاں برداشت نہ کریں گے۔

اسلامی تحریک کے کارکنوں کا یہ باہمی محبت، الفت اور پیار کا وہ تعلق ہے جسے اللہ تعالیٰ نے اپنے عظیم ترین انعامات میں سے شمار کیا ہے اور جس اسلامی جماعت کو یہ نعمت مل جائے اس پر اس کا بڑا خاص فضل و کرم ہے کیونکہ یہ تعلق ہی جماعت کی زندگی اور حرارت کا ضامن ہے اور افراد کو وہ ماحول دیتا ہے جس سے وہ ایک دوسرے کا سہارا بن کر راہِ حق کی منزلیں طے کرتے ہیں اور ایک دوسرے کو نیکی کی راہ پر چلانے کے لیے مستقل کوشاں رہتے ہیں۔ قرونِ اولیٰ کی اسلامی جماعت کو اللہ تعالیٰ نے باہمی اتحاد و محبت اور اخوت کی جو عظیم دولت بخشی تھی اس کی یاد دہانی سورۂ آلِ عمران میں کی گئی ہے اور اسے اپنی نعمت بتایا گیا ہے:

وَاذْكُرُوْا نِعْمَتَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ اِذْ كُنْتُمْ اَعْدَآءً فَاَلَّفَ بَيْنَ قُلُوْبِكُمْ فَاَصْبَحْتُمْ بِنِعْمَتِهٖٓ اِخْوَانًا ۚ (آل عمران: ۱۰۳)

اور اللہ کی اس نعمت کو یاد کرو کہ جب تم آپس میں دشمن تھے تو اس نے تمہارے دلوں کو جوڑ دیا اور تم اس کی مہربانی سے بھائی بھائی بن گئے۔ (آل عمران)

پھر سورۂ انفال میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو مخاطب کرتے ہوئے کہا گیا ہے کہ روئے زمین کی ساری دولت خرچ کرنے کے بعد بھی یہ آپ کے بس کی بات نہ تھی کہ آپ مسلمانوں کے دلوں کو اس طرح الفت و محبت کے رشتے میں جوڑ دیتے۔ یہ صرف اللہ کی قدرت

ہے کہ اس نے ایسا کیا اور وہی ایسا کر سکتا تھا۔ اس نے ایک دین دیا اور اس دین پر ایمان اور اس دین سے محبت کی توفیق دی اور اسی کا نتیجہ ہے یہ پیار و محبت:

لَوْ اَنْفَقْتَ مَا فِی الْاَرْضِ جَمِیْعًا مَّآ اَلَّفْتَ بَیْنَ قُلُوْبِهِمْ وَ لٰكِنَّ اللّٰهَ اَلَّفَ بَیْنَهُمْ ۭ (انفال:۶۳)

اگر خرچ کرتا تو جو کچھ زمین میں ہے سب کا سب، نہیں محبت ڈال سکتا تھا ان کے دلوں میں لیکن اللہ نے ان کے درمیان محبت ڈال دی۔

سیرت کی بنیادی خصوصیات

باہمی تعلقات کا جو معیار اسلام نے مقرر کیا ہے اسے قائم و برقرار رکھنے کے لیے اللہ اور اس کے رسول نے حقوق و فضائل کا ایک ضابطہ بھی تجویز کر کے دیا ہے۔ اس ضابطہ پر عمل کر کے ان تعلقات کو بآسانی دین کے مطلوبہ معیار پر پہنچایا جاسکتا ہے۔ لیکن اس ضابطہ کی اساس چند بنیادی امور پر قائم ہے جنھیں اگر انسان اپنی سیرت میں اختیار کرے تو ان حقوق و فضائل میں سے ایک ایک چیز ان بنیادی صفات کے منطقی نتیجہ کے طور پر ظہور پذیر ہوتی چلی جائے گی۔ یا یوں کہیے کہ پھر یہ صفات آدمی کے اندر سے ایک ایک حق کو ادا کرنے اور ایک ایک فضیلت کو اختیار کرنے کے لیے تقاضا اور مطالبہ کریں گی اور پھر قدم قدم پر نصیحت یا تنبیہ کی ضرورت نہ پڑے گی۔ سب سے پہلی اور بنیادی چیز خیر خواہی ہے۔

خیر خواہی

خیر خواہی کے لیے احادیث میں جو لفظ استعمال ہوا ہے وہ ''نصیحت'' ہے اور یہ لفظ اپنے دامن میں بڑے وسیع معانی سمیٹ لیتا ہے اسی لیے زبان رسالت نے یہاں تک فرمایا کہ:

اَلدِّیْنُ النَّصِیْحَۃُ (ثلاثا)

دین سراسر خیر خواہی ہے۔ (تین بار) (مسلم۔ م ص ۴۲۳)

پھر مزید تشریح کے طور پر ان کے نام شمار کرائے گئے جن کے ساتھ خیر خواہی مطلوب ہے اور ان میں عامۃ المسلمین کا بھی ذکر ہے۔ اسی طرح ایک دفعہ آپ نے کچھ ساتھیوں سے عام مسلمانوں کے لیے خیر خواہی (نصیحت) کی بیعت کی۔ مسلمانوں معانی کی روشنی میں اس لفظ کا

مفہوم یہ ہے کہ تعلق میں کھوٹ نہ ہو۔ دوسرے الفاظ میں ہم اس صفت کو اس طرح متعین کر سکتے ہیں کہ آدمی کے اوپر ہمیشہ اپنے بھائی کی بھلائی و بہتری کی فکر ہی غالب رہے۔ اسی کی بہتری کے لیے سرگرداں ہو اور ہر پہلو سے اس کو فائدہ پہنچانے کی کوشش کرے۔ اس کا کوئی نقصان اور کوئی تکلیف گوارا نہ ہو اور دنیوی یا دینی، جس پہلو سے اس کو مدد پہنچا سکتا ہو اس کی کوشش کرے۔ اس خیر خواہی کا اصل معیار یہ ہے کہ وہ اپنے بھائی کے لیے وہی کچھ پسند کرے جو اپنے لیے پسند کرتا ہے۔ اس لیے کہ آدمی خود کبھی اپنی ذات اور اپنے نفس کا بُرا نہیں چاہ سکتا بلکہ وہ اپنے لیے زیادہ سے زیادہ نفع، بھلائی اور بہتری کے لیے کوشاں رہتا ہے۔ وہ اپنے نفس کے حقوق میں کمی گوارا نہیں کر سکتا۔ وہ اس کے فائدے کے لیے مال اور وقت خرچ کرنے میں دریغ نہیں کر سکتا۔ وہ اس کی برائی نہیں بن سکتا۔ وہ اس کی بے عزتی گوارا نہیں کر سکتا۔ اور وہ اس کے لیے زیادہ سے زیادہ رعایت کا طالب ہوتا ہے۔ بس خیر خواہی کے معنی یہی ہیں کہ آدمی کی سیرت میں یہ صفت پیدا ہو جائے اور اس کا رویہ اس طرز پر نشو و نما پائے کہ وہ اپنے بھائی کے لیے وہی کچھ پسند کرے جو اپنے لیے کرتا ہے۔ مومن کے کردار کی اس صفت کو رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے ایمان کی ایک لازمی شرط ٹھیرایا ہے۔ اور فرمایا ہے کہ:

وَالَّذِیْ نَفْسِیْ بِیَدِہٖ لَا یُؤْمِنُ عَبْدٌ حَتّٰی یُحِبُّ لِاَخِیْہِ مَایُحِبُّ لِنَفْسِہٖ۔

اس ذات کی قسم جس کے دستِ قدرت میں میری جان ہے، کوئی بندہ مومن نہیں ہوتا جب تک کہ وہ اپنے بھائی کے لیے وہی کچھ پسند نہ کرے جو اپنے لیے کرتا ہے۔

پھر اس طرح ایک مسلمان کے دوسرے مسلمان پر جو کچھ اہم حقوق بتائے گئے ہیں، ان میں اس خیر خواہی کو اس طرح بیان کیا گیا ہے:

وَیَنْصَحُ لَہٗ اِذَا غَابَ اَوْشَھِدَ۔

کہ وہ اپنے بھائی کی خیر خواہی کرے خواہ وہ عائب ہو یا موجود ہو۔

اور دوسری حدیث میں بھی یہی بات یوں کہی گئی ہے کہ مسلمان کے مسلمان پر چھ حقوق ہیں ان میں سے ایک یہ ہے کہ:

وَ یُحِبُّ لَهٗ مَا یُحِبُّ لِنَفْسِهٖ۔

وہ اس کے لیے وہی چیز پسند کرے جو اپنے لیے کرتا ہے۔

آگے چل کر ہم دیکھیں گے کہ خیر خواہی کی یہ صفت اپنے دامن میں کتنے حقوق وفضائل سمیٹ لیتی ہے جو براہ راست اس کے لازمی تقاضے کے طور پر وجود میں آتے ہیں۔

ایثار

جب ایک مسلمان اپنے بھائی کے لیے نہ صرف یہ کہ وہی پسند کرتا ہے جو اپنی ذات کے لیے بلکہ اس کو اپنی ذات پر ترجیح دیتا ہے تو کردار کی یہ صفت ایثار ہے اور یہ دوسری بنیادی صفت ہے۔

ایثار کا لفظ اِثر سے نکلا ہے اور اس کے معنی قدم رکھنے اور ترجیح دینے کے ہیں۔ یعنی مسلمان اپنے بھائی کی بھلائی اور بہتری کو اپنے نفس کی بھلائی اور بہتری پر ترجیح دے۔ اپنی ضرورت کو مؤخر کر کے دوسرے کی ضرورت پوری کر دے۔ خود تکلیف اٹھائے دوسروں کو آرام پہنچائے۔ خود بھوکا رہے دوسرے کا پیٹ بھر دے، اپنی طبیعت اور مزاج پر ناگواریاں جھیل لے لیکن اپنے بھائی کے دل پر حتی الوسع کسی ناگواری کا میل نہ آنے دے۔

یہ صفت ایک بلند اخلاقی فضیلت ہے اور ہر شخص سے اس کا تقاضا نہیں کیا جا سکتا۔ اس لیے کہ اس کی بنیاد پر حقوق تو متعین نہیں کیے گئے لیکن خود اس کی اور اس کی بنیاد پر بے شمار اخلاقی فضائل کی تاکید کی گئی ہے۔

یہ ایثار سب سے پہلے ضروریات کے دائرہ میں ہونا چاہیے۔ پھر آسائش و آرام کے دائرہ میں اور پھر مزاج کے تقاضوں کے دائرہ میں۔ یہ آخری چیز خاصی اہم ہے۔ تمام انسان مختلف المزاج ہوتے ہیں اور اس طرح ان طرح ان کے تقاضے مختلف النوع، اور اگر ہر انسان اپنے مزاج کے تقاضوں پر اڑ جائے تو معاشرہ درہم برہم ہو جائے لیکن اگر وہ دوسرے کے ذوق، پسند اور دلچسپی کو ترجیح دینا سیکھ جائے تو پھر انتہائی شیریں اور مخلصانہ تعلقات وجود میں آتے ہیں۔

پھر اس ایثار کا بلند تر درجہ یہ ہے کہ جب ایک آدمی خود تنگی اور عسرت کی حالت میں ہو اور پھر اپنے بھائی کی ضروریات اپنی ضروریات پر مقدم رکھے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے

ساتھیوں کی زندگی ان واقعات سے بھری پڑی ہے اور قرآن نے ان کی صفت کی تعریف کی ہے۔

وَ یُؤْثِرُوْنَ عَلٰٓی اَنْفُسِهِمْ وَ لَوْ كَانَ بِهِمْ خَصَاصَةٌ (حشر:۹)

اور اپنے نفس پر دوسروں کو مقدم رکھتے ہیں اگرچہ ان پر تنگی ہی کیوں نہ ہو۔

انصار نے جس طرح باوجود اپنی عسرت کے مہاجر بھائیوں کا استقبال کیا اور ان کو اپنے درمیان جگہ دی، یہ ایثار کی اچھوتی مثال ہے۔ ایک واقعہ حضرت ابوطلحہ انصار کا ہے جو اس آیت کے شانِ نزول کے طور پر بیان کیا جاتا ہے اور جس میں اس کا بہترین انطباق پایا جاتا ہے۔

''ایک دفعہ ایک آدمی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس بھوکا آیا۔ کاشانۂ نبویؐ میں کچھ نہ تھا۔ آپؐ نے فرمایا جو شخص اس کو آج کی رات مہمان بنائے خدائے تعالیٰ اس پر رحم فرمائے گا۔ حضرت ابوطلحہ اس کو اپنے گھر لے گئے لیکن گھر جا کر بی بی سے معلوم ہوا کہ اتنا ہی کھانے کو ہے کہ مہمان کا پیٹ بھر سکے۔ بولے بچوں کو سلا دو اور چراغ کو بجھا دو۔ ہم دونوں رات بھر بھوکے رہیں گے۔ البتہ مہمان پر یہ ظاہر کریں گے کہ ہم کھا رہے ہیں۔ چنانچہ انھوں نے ایسا ہی کیا۔ صبح کو رسولؐ اللہ کی خدمت میں حاضر ہوئے تو آپؐ نے فرمایا۔ خدائے تعالیٰ تمہارے اس حسنِ سلوک سے بہت خوش ہوا اور یہ آیت سنائی۔ (بخاری، مسلم)

یہ مالی تنگی میں ایثار کا واقعہ تھا لیکن اس سے زیادہ نادر واقعہ ایک جہاد کا ہے جو شانِ ایثار کی انتہائی شکل ہے۔ جب ایک زخمی کے پاس میدانِ جنگ میں پانی پہنچایا گیا تو پاس سے کراہنے کی آواز آئی، انھوں نے کہا پہلے ان کے پاس لے جاؤ۔ جب ان کے پاس پہنچے تو پھر یہی واقعہ پیش آیا اور انھوں نے بھی مرتے وقت اپنے ساتھی کو اپنے اوپر ترجیح دی اور اس طرح چھٹے آدمی تک نوبت آئی اور ہر ایک دوسرے کو اپنے اوپر مقدم کرتا رہا۔ جب چھٹے کے پاس پہنچے تو وہ ختم ہو چکے تھے اور جب پہلوں کے پاس آئے تو سب جان بحق تسلیم ہو چکے تھے۔ رضی اللہ عنہم۔

اس طرح ایثار کے معنیٰ یہ ہیں کہ آدمی اپنے لیے کمتر چیز پر راضی ہو جائے اور اپنے ساتھی کو بہتر چیز دے۔ ایک دفعہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ایک جنگل میں جا رہے تھے۔ آپؐ نے دو مسواکیں کاٹیں۔ ایک سیدھی تھی اور ایک ٹیڑھی۔ آپ کے ساتھ ایک صحابیؓ تھے۔ آپؐ نے سیدھی مسواک انھیں دے دی اور ٹیڑھی خود رکھ لی، انھوں نے کہا: یارسول اللہ! یہ بہتر ہے اور

آپ کے لیے اچھی ہے۔ آپ نے فرمایا جو کوئی شخص کسی سے ایک ساعت بھی صحبت رکھتا ہے تو اس سے قیامت کے دن سوال کیا جائے گا کہ اس نے حق صحبت کا خیال رکھا یا اس کو ضائع کیا۔ (کیمیائے سعادت) یہ اشارہ ہے اس بات کی طرف کہ ایثار بھی صحبت کا ایک حق ہے۔

سیرت کی دو اہم بنیادی صفات جن کو اگر مومن اختیار کرلے تو نہ صرف یہ کہ تعلقات کی خرابی کو کہیں سر اٹھانے کا موقع نہ مل سکے گا بلکہ یہ انتہائی شیریں ہو جائیں گے، عدل اور احسان ہیں جن کی طرف اللہ تعالیٰ نے بحیثیت حکم کے ارشاد فرمایا:

اِنَّ اللّٰهَ يَأْمُرُ بِالْعَدْلِ وَالْاِحْسَانِ (نحل:۹۰)

اللہ تعالیٰ عدل اور احسان پر کاربند رہنے کا حکم دیتا ہے۔

اللہ تعالیٰ حکم دیتا ہے (اِنَّ اللّٰهَ يَأْمُرُ) کا انداز بیان قابل غور ہے۔

عدل کا تصور دو مستقل حقیقتوں سے مرکب ہے۔ ایک یہ کہ لوگوں کے درمیان حقوق میں توازن و تناسب قائم ہو اور دوسرے یہ کہ ہر ایک کو اس کا حق بے لاگ طریقے سے دیا جائے۔ ''اور عدل کے'' حکم کا تقاضا یہ ہے کہ ہر شخص کو اس کے اخلاقی، معاشرتی، معاشی، قانونی، سیاسی، تمدنی، حقوق پوری ایمانداری کے ساتھ ادا کیے جائیں۔ یعنی ایک مسلمان اپنے بھائی کے وہ تمام حقوق ادا کرے جو شریعت نے عائد کیے ہیں۔ اپنے معاملات اس طرز پر طے کرے جس طرز پر شریعت چاہتی ہے۔ سلوک اس نوعیت کا ہو جس نوعیت کا شریعت تقاضا کرتی ہے اور برتاؤ میں وہی روش اختیار کرے جس کا حکم شریعت نے دیا ہے۔ اس لیے کہ شریعت ہی وہ نظام ہے جس میں عدل کے تمام تقاضے بکمال حسن و خوبی ملحوظ رکھے گئے ہیں۔

وَاَنْزَلْنَا مَعَهُمُ الْكِتٰبَ وَالْمِيْزَانَ لِيَقُوْمَ النَّاسُ بِالْقِسْطِ ۚ

(حدید:۲۵)

اور اتاری ہم نے ان کے ساتھ کتاب اور ترازو تا کہ لوگ انصاف کو قائم رکھیں۔

اسی طرح اس کا تقاضا یہ ہے کہ اگر کسی سے برائی کا بدلہ لے تو بس اتنا ہی لے جتنی برائی کی گئی ہے جو اس سے بڑھا اس نے عدل سے تجاوز کیا۔

عدل کی مزید تشریح جو اس کے تصور کو بالکل مکمل کر دیتی ہے اس حدیث میں ہے جس

میں نبی کریم صلعم نے ان نو باتوں کا ذکر کیا ہے جن کا حکم اللہ کی طرف سے دیا گیا ہے ان میں سے ایک یہ ہے کہ:

كَلِمَةُ الْعَدْلِ فِي الْغَضَبِ وَالرِّضَاءِ۔

غضب کی حالت ہو یا ناراضگی کی، بہر صورت عدل کے کلمے پر رہو۔

دراصل کمالِ سیرت کی بنیادی علامت یہ ہے کہ آدمی کی قلبی کیفیت کچھ بھی ہو، لیکن وہ عدل کے راستے سے سرِ مو نہ ہٹے اور اس میں اصل چیز یہ ہے کہ آدمی کے کردار میں اتنی طاقت ہو کہ خواہ آدمی کے دل میں اپنے بھائی کی طرف سے غبار اور میل ہو لیکن پھر بھی وہ اپنے معاملات، برتاؤ اور رویہ کو شریعت کے تقاضوں سے ہٹنے نہ دے۔ اس عدل کے بعد اگلی چیز احسان ہے جو عدل سے زائد ایک چیز ہے۔

احسان

اس کی اہمیت باہمی تعلقات میں عدل سے بھی زیادہ ہے۔ عدل اگر تعلقات کی اساس ہے تو احسان اس کا جمال اور کمال ہے۔ عدل اگر تعلقات کو ناگواریوں اور تلخیوں سے بچاتا ہے تو احسان اس میں شیرینیاں اور خوشگواریاں پیدا کرتا ہے۔ کوئی تعلق صرف اس بنیاد پر قائم نہیں رہ سکتا کہ ہر فریق ناپ تول کر کے دیکھتا رہے اور اپنے واجب الوصول حقوق میں کسی طرح کی کمی اور دوسروں کے واجب الادا حقوق میں کسی طرح کا اضافہ گوارا نہ کرے۔ ایسے ایک کھرے تعلق میں کش مکش تو نہ ہوگی مگر محبت و شکر گزاری، عالی ظرفی و ایثار اور اخلاق و خیر خواہی کی نعمتوں سے وہ محروم رہے گا جو دراصل زندگی میں لطف و حلاوت پیدا کرنے والی ہیں۔ یہ نعمتیں احسان سے حاصل ہوں گی جس سے مراد ہے نیک برتاؤ، فیاضانہ معاملہ، ہمدردانہ رویہ، رواداری، خوش خلقی، درگزر، باہمی مراعات، ایک دوسرے کا پاس و لحاظ، دوسرے کو اس کے حق سے کچھ زیادہ دینا اور خود اپنے حق سے کچھ کم پر ہی راضی ہو جانا۔

اس احسان کا تصور بھی نو باتوں والی حدیث کی تین باتیں مکمل اور واضح کرتی ہیں کہ:

اَنْ اَصِلَ مَنْ قَطَعَنِیْ وَاُعْطِیَ مَنْ حَرَمَنِیْ وَاَعْفُوَ عَمَّنْ ظَلَمَنِیْ۔

جو مجھ سے کٹے میں اس سے جڑوں اور جو مجھ کو (حق سے) محروم کرے میں اسے (اس کا حق) دوں اور جو میرے اوپر ظلم کرے میں اس کو معاف کر دوں۔

یعنی کردار کی یہ صفت اس کا تقاضا کرتی ہے کہ نہ صرف یہ کہ آدمی اپنے بھائی کو بھلائی کا بدلہ اس سے زائد بھلائی سے دے بلکہ یہ بھی کہ اگر وہ برائی کرے تو اُس کا جواب بھی بھلائی سے دے۔

وَيَدْرَءُونَ بِالْحَسَنَةِ السَّيِّئَةَ۔

اور برائی کو بھلائی کے ذریعہ دفع کرتے ہیں۔

ان چار صفات کے بعد پانچویں چیز وہ ہے جس کے لیے میں رحمت کا لفظ استعمال کروں گا لیکن جس کے لیے نہ معلوم کتنی اصطلاحات استعمال کی گئی ہیں۔

رحمت

رحمت کا لفظ میں نے اس لیے استعمال کیا ہے کہ خود اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کے باہمی تعلق کی تصویر کھینچنے کے لیے اس لفظ کو اختیار کیا ہے اور یہ چیز اس کے وسعتِ معانی کی طرف اشارہ کرتی ہے۔

مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰهِ ؕ وَ الَّذِيْنَ مَعَهٗۤ اَشِدَّآءُ عَلَى الْكُفَّارِ رُحَمَآءُ بَيْنَهُمْ (فتح:۲۹)

محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور جو لوگ ان کے ساتھی ہیں کفار پر سخت ہیں اور باہم سراپا رحمت ہیں۔

اس صفت کو صحیح طور پر سمجھنے کے لیے ہم اس کو دل کی نرمی اور گداز سے تعبیر کر سکتے ہیں جس کے نتیجہ میں آدمی کا رویہ اپنے بھائی کے لیے انتہائی محبت، گرم جوشی، سوز و شفقت اور الفت کا مظہر ہو جاتا ہے۔ اس کے بھائی کو اس سے ذرّہ برابر بھی کوئی ایذا تکلیف یا ٹھیس پہنچنے کا تصور بھی اس کے لیے کربناک ہوتا ہے یہ رحمت ہی کی صفت ہے جو آدمی کو ہر دلعزیز بناتی ہے اور انسانوں کو اس کی طرف پروانہ وار کھینچتی ہے۔ رسول اللہ کی اہم صفات میں سے ایک صفت یہی ہے جس کا ذکر قرآن نے کیا ہے اور دعوت و تربیت کے سلسلہ میں اس کی کئی مثالیں پیش کی ہیں:

لَقَدْ جَآءَكُمْ رَسُوْلٌ مِّنْ اَنْفُسِكُمْ عَزِيْزٌ عَلَيْهِ مَا عَنِتُّمْ حَرِيْصٌ عَلَيْكُمْ بِالْمُؤْمِنِيْنَ رَءُوْفٌ رَّحِيْمٌ ﴿۱۲۸﴾ (توبہ:۱۲۸)

بے شک تمہارے پاس خود تم میں سے رسول آیا۔ تم کو کوئی تکلیف پہنچے تو ان کو گراں ہوتی ہے۔ تمہاری بھلائی پر وہ حریص ہے اور مومنین کے لیے سراپا الفت و رحمت۔

اور سورۂ آلِ عمران میں بتایا گیا ہے کہ اگر آپ کا دل نرم نہ ہوتا تو لوگ کبھی آپؐ کے گرد جمع نہ ہوتے اور یہ دل کی نرمی اللہ کی رحمت ہے۔ فرمایا:

فَبِمَا رَحْمَةٍ مِّنَ اللّٰهِ لِنْتَ لَهُمْ ۚ وَلَوْ كُنْتَ فَظًّا غَلِيْظَ الْقَلْبِ لَانْفَضُّوْا مِنْ حَوْلِكَ ۖ (آلِ عمران:۱۵۹)

اللہ کی رحمت سے آپؐ ان کے لیے نرم دل واقع ہوئے ہیں۔ اگر کہیں بدخو اور سخت دل ہوتے تو یہ تمہارے پاس سے بھاگ کھڑے ہوتے۔

ایمان کا نتیجہ الفت ہے اور الفت سخت دلی کے ساتھ جمع نہیں ہوسکتی۔ لہٰذا ایک مومن جو سراپا الفت ہوتا ہے۔ سراپا نرمی بھی ہوتا ہے۔ ورنہ اس کے لیے ایمان میں کوئی بھلائی نہیں۔ اس حقیقت پر رسول اللہ نے یوں روشنی ڈالی ہے:

اَلْمُؤْمِنُ مَاْلَفٌ وَلَا خَيْرَ فِيْمَنْ لَا يَاْلَفُ وَلَا يُؤْلَفُ۔

مومن محبت و الفت کا پتلا ہوتا ہے اور جو نہ محبت کرتا ہے اور نہ اس سے محبت کی جاتی ہے اس میں کوئی بھلائی نہیں ہے۔

اور اس لیے یہ فرمایا کہ:

مَنْ يُّحْرَمُ الرِّفْقَ يُحْرَمُ الْخَيْرَ (عن جریر فی المسلم۔ مشکوٰۃ)

جو نرمی سے محروم کیا گیا وہ بھلائی سے محروم کر دیا گیا۔

اس بات کی مزید تشریح یوں کی:

مَنْ اُعْطِيَ حَظَّهٗ مِنَ الرِّفْقِ اُعْطِيَ حَظَّهٗ مِنْ خَيْرِ الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةِ۔ (عن عائشہ شرح السنۃ ۴۳۱)

کہ جس شخص کو نرمی سے اس کا حصہ دیا گیا اس کو دنیا اور آخرت کی بھلائی میں سے اس کا حصہ دے دیا گیا۔

آپ نے ایک دفعہ جنتی آدمیوں میں سے ایک شخص کو گنایا جو اپنے رشتہ داروں اور ہر مسلمان کے لیے رحیم اور رقیق القلب ہے رحیم رقیق القلب لکل ذی قربیٰ ومسلم (رواہ مسلم) یہ اس کے لیے رحمت سے محرومی اور بدبختی ہے جو زمین پر بندوں پر رحم نہیں کرتا وہ اللہ کی رحمت سے محروم ہو جاتا ہے اور جو زمین پر اللہ کے بندوں پر رحمت کرتا ہے اس کے لیے اللہ کی رحمت واجب ہو جاتی ہے۔ چنانچہ فرمایا:

لَا تُنْزَعُ الرَّحْمَةُ اِلَّا مِنْ شَقِيٍّ۔ (عن ابی ہریرۃ احمد، الترمذی، مشکوٰۃ ص:۴۲۳)

رحمت کسی سے چھینی نہیں جاتی مگر اس سے جو بد بخت ہو۔

اور مزید یہ کہ:

الرَّاحِمُوْنَ يَرْحَمُهُمُ الرَّحْمٰنُ اِرْحَمُوْا مَنْ فِي الْاَرْضِ يَرْحَمْكُمْ مَّنْ فِي السَّمَآءِ۔ (عن عبداللہ بن عمر۔ رواہ ابوداؤد والترمذی مشکوٰۃ ص:۴۲۳)

جو رحم کرنے والے ہیں۔ رحمٰن ان پر رحم کرتا ہے، تو زمین والوں پر رحم کر وتا کہ آسمان والا تم پر رحم کرے۔

اس نرمی و رحمت کے جو دو مختلف پہلو چھوٹوں اور بڑوں کے ساتھ ظہور پذیر ہوتے ہیں۔ یعنی شفقت وعزت اس کا ذکر اس طرح فرمایا ہے کہ:

لَيْسَ مِنَّا مَنْ لَّمْ يَرْحَمْ صَغِيْرَنَا وَلَمْ يُوَقِّرْ كَبِيْرَنَا۔

(ابی داؤد ترمذی مشکوٰۃ ص:۴۲۳)

جو ہمارے چھوٹوں پر رحم نہ کرے اور ہمارے بڑوں کی عزت نہ کرے وہ ہم میں سے نہیں ہے۔

ایک مسلمان اپنے بھائی کے ساتھ تعلقات میں سراپا نرم ہوتا ہے اور اپنے معاملات میں اس بات کی کوشش کرتا ہے کہ ہر ممکن طریقہ سے اس کے دل کو خوش رکھے اور اس کو تکلیف نہ ہونے دے اور اس کا ہر جائز مطالبہ پورا کر دے اس امر کو رسولؐ اللہ نے ایک مثال سے یوں سمجھایا کہ:

اَلْمُؤْمِنُوْنَ هَيِّنُوْنَ لَيِّنُوْنَ كَالْجَمَلِ اِنْ قِيْدَ اِنْقَادَ وَاِنْ اُنِيْخَ عَلٰى مَخْرَةٍ اِسْتَنَاخَ۔ (رواہ الترمذی عن مکحول۔ مشکوٰۃ ۴۲۳)

مومن بُردبار اور نرم دل ہوتے ہیں، اس اونٹ کی مانند جس کی ناک میں نکیل پڑی ہو۔ اگر کھینچا جائے تو کھنچتا چلا جائے اور پتھر پر بٹھایا جائے تو پتھر پر بیٹھ جائے۔

قرآن نے بڑے مختصر انداز میں اس پوری کیفیت کو یوں بیان کیا ہے۔ (اَذِلَّةٍ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ)

دراصل یہ رحمت سیرت کی وہ صفت ہے جو تعلقات میں ایک نئی روح ڈال دیتی ہے اور ان کے حسن و جمال کو مکمل کرتی ہے اور ایک شخص جو ایک مرتبہ اس رحمت سے لطف اندوز ہو جاتا ہے پھر اس کا دل اس تعلق کو توڑنے کے لیے مشکل سے راضی ہوتا ہے جس کے ذریعہ اس کو یہ نعمت ملتی ہے۔

عفو

عفو کا مفہوم معاف کر دینا ہے لیکن اس مفہوم میں وہ بہت ساری چیزیں شامل ہیں جو الگ الگ بھی شمار ہوتی ہیں لیکن چونکہ ان کا اس صفت سے گہرا تعلق ہے اس لیے ہم نے انھیں اس کے تحت شامل کر دیا ہے۔ مثلاً غصہ کا ضبط کرنا، صبر و تحمل اور بُردباری وغیرہ۔

جب دو آدمیوں کا تعلق قائم ہوگا تو یہ ایک فطری امر ہے کہ ہر ایک سے بہت ساری ایسی چیزیں سرزد ہوں گی جو دوسرے کے لیے ناگواری، تلخی، تکلیف اور اذیت کا باعث ہوں گی، جن پر اسے غصہ آئے گا اور جن میں سے بعض پر اُسے قانوناً بدلہ لینے کا حق بھی ہوگا۔ ایک پیارو محبت کا تعلق اپنے استحکام کے لیے اس بات کا متقاضی ہوتا ہے کہ ایسے تمام موقعوں پر محبت غالب آئے اور ایک بھائی میں اتنی وسیع القلبی ہو کہ وہ اپنے غصہ کو پی جائے اور باوجود انتقام کی قدرت کے انتقام نہ لے اور اس طرح عفو کی روش پر کاربند ہو۔ رسولؐ اللہ کا یہ خاص شیوہ تھا اور اللہ تعالیٰ نے اس کے لیے آپؐ کو بے شمار جگہ نصیحت کی ہے۔

خُذِ الْعَفْوَ اور فَاعْفُ عَنْهُمْ وَاسْتَغْفِرْ لَهُمْ۔

اور مسلمانوں کو تقویٰ کی صفات بتاتے ہوئے یہ بھی کہا کہ:

وَالْكٰظِمِيْنَ الْغَيْظَ وَالْعَافِيْنَ عَنِ النَّاسِ ؕ (آلِ عمران: ۱۳۴)

جب آدمی کو کوئی تکلیف پہنچے یا کوئی نقصان ہو تو سب سے پہلے غصہ اس کے دل و دماغ پر قابو پانے کی کوشش شروع کرتا ہے اور اگر غصہ دل و دماغ پر قابو پا لے تو پھر عفو تو درکنار آدمی ایسی ایسی حرکتیں کر بیٹھتا ہے کہ آئندہ خوش گوار تعلقات کی امید بالکل منقطع ہو جاتی ہے۔ اس لیے سب سے پہلے آدمی کو اپنا غصہ پی جانے کی فکر کرنی چاہیے۔ جب ہی وہ ٹھنڈے دل سے معاملہ پر غور کر سکے گا اور پھر اگر عفو کی پالیسی اختیار بھی نہ کرے تو کم از کم عدل سے تجاوز نہ کرے گا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے مختلف فرمودات میں اس کے خطرات سے آگاہ کرتے ہوئے اس کو دبانے کی ترغیب دی ہے فرمایا:

اِنَّ الْغَضَبَ لَيُفْسِدُ الْاِيْمَانَ كَمَا يُفْسِدُ الصَّبِرُ الْعَسَلَ۔

(بیہقی، مشکوٰۃ۔ ۴۳۴، ۴۳۴)

بے شک غصہ ایمان کو اس طرح خراب کر ڈالتا ہے جس طرح ایلوہ شہد کو۔

مَا تَجَرَّعَ عَبْدٌ اَفْضَلُ عِنْدَ اللّٰهِ عَزَّ وَجَلَّ مِنْ جُرْعَةِ غَيْظٍ يَكْظِمُهَا ابْتِغَآءَ وَجْهِ اللّٰهِ تعالیٰ۔ (رواہ احمد حسن ابن عمر مشکوٰۃ: ۴۳۴)

بندہ کوئی گھونٹ نہیں پیتا جو اللہ کے نزدیک اس غصہ کے گھونٹ سے زیادہ بہتر ہو جو وہ خدا کی خوشنودی کی خاطر پی جاتا ہے۔

اسی طرح آپؐ نے صبر کی تعلیم دی اور یہ بتایا کہ سب سے بہتر رویہ یہ ہے کہ آدمی ایذاؤں پر صبر کرے اور مل جل کر رہے، بجائے اس کے کہ قطع تعلق کرے۔ آپؐ نے فرمایا:

اَلْمُسْلِمُ يُخَالِطُ النَّاسَ وَيَصْبِرُ عَلٰىٓ اَذَاهُمْ اَفْضَلُ مِنَ الَّذِىْ لَا يُخَالِطُهُمْ وَلَا يَصْبِرُ عَلٰى اَذَاهُمْ۔

(عن ابن عمر۔ ترمذی و ابن ماجہ، مشکوٰۃ: ۴۳۳)

وہ مسلمان جو لوگوں سے ملا جلا رہے اور ان کی ایذاؤں پر صبر کرے اس سے بہتر ہے جو ملنا جلنا چھوڑ دے اور ایذاؤں پر صبر نہ کرے۔

ایک دفعہ حضرت ابوبکرؓ کو نصیحت کرتے ہوئے آپؐ نے منجملہ اور باتوں کے یہ کہا کہ:

عَبْدًا ظُلِمَ بِظُلْمَةٍ فَيَغْضُّ عَنْهَا لِلّٰهِ عَزَّوَجَلَّ اَلَّا اَرَا اللّٰهَ بِمَا نَصَرَهٗ۔ (بیہقی ابوہریرہ)

جس بندہ پر ظلم کیا جائے اور وہ صرف خدا کے لیے خاموش رہے تو اللہ اس کی زبردست مدد کرتا ہے۔

صبر سے آگے مقام یہ ہے کہ آدمی اپنے بھائی کو خوش دلی کے ساتھ معاف کردے باوجود اس کے کہ وہ انتقام اور بدلہ کی طاقت رکھتا ہو۔ چنانچہ آپؐ نے فرمایا کہ حضرت موسیٰؑ نے اللہ سے سوال کیا کہ بندوں میں کون تیرے نزدیک عزیز ہے! تو اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

مَنْ اَعَزَّ عِبَادَکَ عِنْدَکَ قَالَ : مَنْ اِذَا قَدَرَ عَذَرَ۔

(عن ابی ہریرہ، بیہقی)

وہ شخص جو انتقام کی قدرت رکھنے کے باوجود معاف کردے۔

اور اسی طرح جو آدمی اپنے بھائی کا عذر قبول نہ کرے اس کو یہ وعید سنائی، فرمایا کہ:

مَنِ اعْتَذَرَ اِلٰی اَخِیْهِ فَلَمْ یَعْذِرْهُ اَوْ لَمْ یَقْبَلْ عُذْرَهٗ عَلَیْهِ مِثْلُ خَطِیْئَةِ صَاحِبِ مَکْسٍ۔ (عن جابر رواہ بیہقی فی شعب الایمان، مشکوٰۃ:۴۳۹)

جس نے ضبط کرلیا اس حال میں کہ وہ اسے پورا کرنے کی قدرت رکھتا تھا قیامت کے دن خداوند کریم اسے تمام مخلوق کے سامنے بلائے گا اور جس حور کو چاہے اسے انتخاب کرنے کا اختیار دے دے گا۔

جو دنیا میں معاف کریں گے اللہ تعالیٰ ان کی خطائیں معاف کرے گا۔

وَلْيَعْفُوْا وَلْيَصْفَحُوْا ؕ اَلَا تُحِبُّوْنَ اَنْ يَّغْفِرَ اللّٰهُ لَكُمْ ؕ وَاللّٰهُ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴿۲۲﴾ (نور:۲۲)

چاہیے کہ وہ عفو و درگزر سے کام لیں۔ کیا تم اسے پسند نہیں کرتے کہ اللہ تعالیٰ تمھیں بخش دے۔ اللہ تعالیٰ بڑا بخشنے والا اور رحم کرنے والا ہے۔

برائی کے برابر برائی کا بدلہ لینا جائز ہے۔ لیکن جو معاف کردے تو اس کا اجر خاص اللہ کے ذمہ ہے:

وَ جَزٰٓؤُا سَیِّئَةٍ سَیِّئَةٌ مِّثْلُهَا ۚ فَمَنْ عَفَا وَ اَصْلَحَ فَاَجْرُهٗ عَلَى اللّٰهِ ؕ اِنَّهٗ لَا یُحِبُّ الظّٰلِمِیْنَ ۝ (شوریٰ:۴۰)

برائی کا بدلہ اتنی ہی برائی ہے، پس جس نے معاف کیا اور مصالحت کی اس کا اجر اللہ کے ذمہ ہے اور وہ ظالموں کو پسند نہیں کرتا۔

عفو کی یہ صفت پیدا کرنا کوئی آسان کام نہیں بلکہ بڑے عزم کا کام ہے۔

وَ لَمَنْ صَبَرَ وَ غَفَرَ اِنَّ ذٰلِكَ لَمِنْ عَزْمِ الْاُمُوْرِ ۝ (الشوریٰ:۴۳)

اور جس نے صبر کیا اور بخش دیا تو یہ بڑی ہمت کا کام ہے۔

لیکن یہی وہ چیز ہے، جو تعلقات میں بڑی بلندی اور پاکیزگی پیدا کر دیتی ہے اور اس لیے یہ ایک انتہائی اہم صفت ہے۔

دو مزید صفات کا ذکر بھی یہاں ضروری معلوم ہوتا ہے۔ ایک باہمی اعتماد اور دوسرے قدر و قیمت کا احساس۔

اعتماد

اعتماد کا پورا پورا تصور ولایت کا وہ لفظ اپنے اندر سمیٹ لیتا ہے جو قرآن نے مسلمانوں کے باہمی تعلقات کی تعبیر کے لیے استعمال کیا ہے دراصل ولی کہتے ہی اس کو ہیں جو کاملاً قابل اعتماد ہو، جس کو آدمی اپنے تمام راز اور معاملات پورے اطمینان سے سپرد کر سکے۔ اخوت کے اس تعلق کا تقاضا ہوتا ہے کہ آدمی اپنے ساتھیوں پر اعتماد کرے اور ان کو اپنے زندگی کے معاملات میں برابر کا شریک بنائے۔

قدر و قیمت کا احساس

یہ آخری چیز ہے اور اس کا مقصود صرف یہ ہے کہ آدمی اس تعلق کی اہمیت اور حیثیت سے اتنا واقف ہو کہ اس کا دل اس کی صحیح قدر و قیمت محسوس کر سکے۔ جب ہی یہ ممکن ہوگا کہ آدمی کسی قیمت پر بھی اس تعلق کا ٹوٹنا گوارا نہ کرے۔

ان بنیادی اصولوں اور صفات کی روشنی میں اللہ اور اس کے رسولؐ نے ہم کو تفصیلی